شاہد حسین رزاقی

سرسیّد کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت

ہندوستان پر مسلمانوں نے سات سو برس تک حکومت کی اور ان کے کارناموں نے دنیا کی تاریخ میں اس ملک کو بھی باعزت اور باوقار بنا دیا۔ مسلمان ہندوستان میں اجنبی نہیں بنے رہے۔ بلکہ یہاں کی ایک قوم بن گئے اور نہ صرف سیاسی و معاشی برتری بلکہ اعلیٰ تہذیب و تمدن، ذاتی اوصاف اور قومی خصوصیات کے اعتبار سے بھی وہ ہندوستانی معاشرہ میں سب سے زیادہ معزز و ممتاز رہے اور ان کی یہ فضیلت و برتری صدیوں تک قائم رہی مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی حالت نہ صرف سیاسی اعتبار سے انتہائی خراب تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت کے لحاظ سے بھی یہ ملک نہایت پستی کی حالت میں تھا۔ اور ہندوستانی معاشرہ بحیثیت مجموعی ایک نیم وحشی معاشرہ تھا۔ جس میں ذات پات، چھوت چھات، ستی، دختر کشی اور حیوان پرستی جیسے غیر مہذب طریقے نہ صرف رائج تھے۔ بلکہ یہ معاشرہ کی اساس بھی تھے اور ان کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مسلمان ہندوستانی معاشرہ کی ان خرابیوں کو پوری طرح ختم نہ کر سکے۔ کیونکہ ان کو مذہبی تائید حاصل تھی۔ چنانچہ انگریزی دورِ حکومت میں بھی ان بری رسموں میں سے صرف ستی اور دختر کشی کو بمشکل تمام ختم کیا جا سکا اور دوسری رسمیں اب تک جاری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں بھی عام معاشرہ میں کوئی فوری اور بڑا انقلاب نہ ہو سکا۔ لیکن اعلیٰ اور متوسط طبقوں نے جن میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت شامل تھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور مسلمان فرمانرواؤں اور ان کے امرا کے تمدنی کارنامے تو اس قدر عظیم الشان تھے۔ کہ ان کی بدولت ہندوستان بھی اس زمانے کے مہذب ترین

ممالک میں شمار ہونے لگا۔ جب تک مسلمان حکمران اور تمدنی پذیر رہے ان کی یہ امتیازی حیثیت بھی قائم رہی لیکن جب ان کو زوال ہونے لگا تو ان میں طرح طرح کی خرابیاں بھی پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ حکومت سے محرومی اور انگریزوں کی محکومی نے ان کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور ان کا مستقبل نہایت تاریک نظر آنے لگا۔

مسلمانوں کا زوال

مسلمانوں کی زندگی میں جو نقائص پیدا ہو گئے تھے وہ ان کے زوال کا سبب بنے اور ان میں سب سے زیادہ نقصان رساں وہ معاشرتی خرابیاں تھیں جن کی جڑیں رفتہ رفتہ بہت گہری اور مضبوط ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں میں یہ خرابیاں ان کے سیاسی زوال سے پہلے ہی پیدا ہونے لگی تھیں اور آخر کار یہ اتنی عام ہو گئیں کہ پورا معاشرہ ان سے متاثر ہو گیا اور یہ خرابیاں بھی مسلم قوم کے زوال کا بنیادی سبب بن گئیں۔ ہندوؤں کے معاشرتی اثرات ان کے عقائد و نظریات، رسوم و رواج اور توہمات اور طرز معاشرت نے مسلمانوں پر رفتہ رفتہ اتنا اثر ڈالا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا معاشرہ اسلامی خصوصیات سے بڑی حد تک محروم ہو گیا اور زندگی کے اہم شعبوں پر غیر اسلامی اثرات غالب آ گئے۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں ہندو قوم میں کئی نامور مصلح پیدا ہوئے جن کی کوششوں سے ہندوؤں نے اپنی معاشرتی حالت درست کرنے پر توجہ کی اور حالات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن ان کے برعکس مسلمان زمانے کے تقاضوں سے بالکل غافل رہے اور اپنی حالت بہتر بنانے پر کوئی توجہ نہ کی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بدلتے ہوئے حالات نے مسلمانوں کی معاشرتی حالت کو بد سے بدتر بنا دیا اور ان کے معاشرتی عیوب پہلے سے بہت زیادہ نقصان رساں ہو گئے۔

سیاسی زوال کی وجہ سے مسلمانوں کا معاشرتی وقار بہت گر گیا تھا۔ حکومت، عہدے اور جاگیر و منصب ان کی معاشرتی برتری اور معاشی خوشحالی کا ذریعہ تھے، اور جب مسلمان ان ذرائع سے محروم ہو گئے تو ان کی اقتصادی حالت بھی خراب ہو گئی۔ حکومت و سلطنت چھن جانے سے وہ اپنے معاشرتی مرتبے سے اس طرح گر گئے کہ اپنی محکوم قوموں کی سطح پر آ گئے، اور ایک ایسی یورپی قوم کے محکوم بنے جو ان کو شک و شبہ اور خطرہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور اسی بنا پر مسلمانوں کے مقابلے میں ان قوموں کو ترجیح دیتی تھی جو صدیوں مسلمانوں کی محکوم رہ چکی تھیں۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے، اور ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم

سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کی طرف سے ان کے تمام اندیشے بالکل درست تھے۔ چنانچہ انہوں نے آئندہ خطرات کا انسداد کرنے کے خیال سے مسلمانوں کو ہر طرح سے تباہ و برباد کر دیا۔ ہزاروں لوگ جو مختلف حیثیتوں سے سربرآوردہ تھے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ باعزت لوگ بے عزت کئے گئے۔ دولت مند اور خوشحال گھرانے مفلس و محتاج بنا دیئے گئے۔ اور جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پوری مسلم قوم کو ظلم و ستم کا شکار بنا کر ایسے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا گیا جن سے نجات پانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس طرح وہ قوم جو ہندوستانی معاشرہ میں صدیوں تک معزز و ممتاز اور باوقار رہی ذلیل و خوار ہو گئی اور اس کی مکمل تباہی یقینی معلوم ہونے لگی۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر جن اوصاف و خصوصیات کی ضرورت تھی وہ ان میں باقی نہ رہے تھے اور ان کو پھر پیدا کرنا نہایت اہم اور ضروری لیکن انتہائی مشکل کام تھا۔

مسلم معاشرہ کی عام کیفیت

ہندوستانی مسلمانوں کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے ان کے پورے معاشرہ کی اصلاح کرنا لازمی تھا جس کو غیر اسلامی اثرات، رسوم و رواج اور توہمات نے بالکل بگاڑ دیا تھا۔ اور خود مسلمانوں کے غلط رجحانات نے بھی اس کی صورت مسخ کر دی تھی۔ ذات پات کی تفریق، فرقہ وارانہ اختلاف اور تعصب و تنگ نظری نے ملی اتحاد اور معاشرتی ہم آہنگی کو ختم کر دیا تھا۔ اور مختلف فرقے ایک دوسرے کو اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ عورتوں کی محکومی، حق تلفی اور جہالت اور کثرتِ ازدواج جیسی بری رسموں نے پورے معاشرہ پر تباہ کن اثر ڈالا تھا۔ اور غلامی کے انسداد کی تحریک عام ہو جانے کے باوجود لونڈی غلام رکھنے کا طریقہ ملک کے بہت سے حصوں میں باقی تھا۔ شادی غمی ہر موقع پر بری رسموں اور رواج کی پابندی شدت سے کی جاتی تھی جن سے معاشرتی اور معاشی ہر لحاظ سے نقصان ہوتا تھا۔ چھوت چھات کا اثر اس قدر بڑھا تھا کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانا پینا بھی مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی مسلمانوں کو اپنے مذہب سے بڑی محبت رہی لیکن عقائد کی خرابی نے مذہب کی شکل بھی بگاڑ دی۔ چنانچہ اسلام کے بنیادی اصول و مقاصد کو نظر انداز کر دیئے گئے۔ اور فروعات کو اصل دین سمجھ کر گمراہ کن عقائد کی پیروی کی جانے لگی۔ اسلام اور بانیٔ اسلام سے غلط باتیں منسوب کر کے ان کی اتباع کو دین داری قرار دیا جاتا تھا۔ اور اصل دین کی پیروی کرنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ دین کو دنیا سے الگ کر کے محض اوراد و وظائف

کو عبادت تصور کیا جاتا تھا۔ اور یہ حقیقت بالکل فراموش کر دی گئی تھی کہ اسلام ایک مکمل دین اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ہے۔ تقلید پرستی نے غور و فکر اور اجتہاد کرنے کی راہیں بند کر دی تھیں۔ اور پیری مریدی کی بگڑی ہوئی شکل نے ایک ایسا گمراہ کن مذہبی طبقہ بنا دیا تھا جو دین اور دنیا دونوں کو برباد کر رہا تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے بھی پوری قوم کی حالت بہت خراب تھی۔ تعصب، تنگ نظری باہمی مخالفت و عداوت، خوشامد پسندی، جھوٹی شان و شوکت کا اظہار، ماضی اور اسلاف پر بے جا ناز، قدامت پرستی میں شدت، اصلاح و ترقی سے نفرت، جد و جہد سے گریز اور مایوسی و الم پسندی جیسی تباہ کن خرابیاں خصلت و عادت بن گئی تھیں۔ معاشرہ کی ان تمام خرابیوں کی اصلاح کرنے کی موثر ترین تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ تعلیم کی اشاعت کر کے لوگوں میں اپنی حالت کا شعور اور ترقی کا احساس پیدا کیا جائے۔ لیکن اس راستے میں بھی بڑی دشواریاں حائل تھیں۔ عوام بالکل جاہل تھے۔ اور جن لوگوں نے تعلیم پائی تھی وہ صحیح تعلیم اور اچھی تربیت سے بالکل محروم رہے تھے۔ تعلیم کا طریقہ نہایت ناقص تھا اور جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ اس زمانے کے لئے بالکل بے فائدہ اور بے کار تھیں۔ آباؤ اجداد کے پرانے علوم پر بڑا ناز تھا اور اس بات کا پتہ تک نہ تھا کہ اس کے بعد سینکڑوں سال کے دوران میں ان علوم نے کس قدر ترقی کر لی ہے جدید علوم کی نوعیت کیا ہے اور اس کے کیا فوائد ہیں اس سے تو مطلق واقفیت نہ تھی لیکن جہالت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان سے نفرت کرتے تھے اور ان کو ناپاک سمجھتے تھے۔ اور اس کے خلاف ان کا تعصب اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جب حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کی تو ہندوؤں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا لیکن مسلمانوں نے آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخطوں سے حکومت کو ایک محضر پیش کیا جس میں انگریزی کی تعلیم سے اختلاف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت اس طریقے سے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ایسے ناموافق اور دشوار حالات میں معاشرہ کی اصلاح کرنا بہت بڑا اور بہت مشکل کام تھا۔ اور اس کے لئے ایسے مصلحین کی ضرورت تھی جو غیر معمولی اوصاف اور صلاحیتوں کے مالک ہوں، جن کے دل میں قوم کا سچا درد اور خلوص ہو جو قوم کے امراض کی صحیح تشخیص کر کے ان کو دور کرنے کی موثر تدبیریں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو ہر قسم کی مخالفت اور رکاوٹ کے باوجود معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے پورے عزم و استقلال سے اپنی

جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔

سرسید کے تاثرات

قومی زوال وادبار کے اس نازک دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوش قسمتی سے سرسید احمد خاں جیسا عظیم مصلح اور رہنما مل گیا جن کی کوششوں نے تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کو بچالیا۔ سرسید کی اصلاحی سرگرمیوں نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کرلی جو انتہائی ناموافق حالات کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان معاشری اصلاح اور قومی ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئے۔

سرسید نے جس قوم کی ہمہ جہتی معاشری اصلاح اور ترقی کا مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو زوال و پستی کی حالت سے نکال کر ترقی دینے کی کوشش کی وہ کس حال میں تھی اور اس کے لئے کن کن اصلاحات کی ضرورت تھی۔ اس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں انہوں نے اس دور کے مسلمانوں کی جو کیفیت بیان کی ہے اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ پوری قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اور ذہنی، اخلاقی، معاشری، اقتصادی ہر اعتبار سے تمام طبقوں کا جو برا حال تھا۔ ان سب کا سرسید نے بہت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کے تاثرات یہ تھے۔ کہ اس ملک میں ہماری قوم کا حال نہایت بدتر ہے۔ اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے تکبر و غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے دین و دنیا دونوں میں بیکار آمد نہیں علم ادب وانشاء کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن کلموں کے تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ فنِ شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہوتا اور وہ بھی نیک جذباتِ انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تہذیب واخلاق کے خلاف ہیں۔ علم دین تو وہ خراب ہوا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اس معصوم، سیدھے سادے، سچے اور نیک طبیعت والے

پیغمبرؐ نے جو خدا کے احکام بہت سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے جاہل ان پڑھ بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہونچائے تھے اس میں وہ نکتہ چینیاں اور باریکیاں گھڑی گئیں اور وہ مسائل فلسفیہ اور دلائل منطقیہ ملائی گئیں کہ اس میں اس سچائی، صفائی اور سادگی کا مطلق اثر نہیں رہا۔ یہ مجبوری لوگوں کو اصلی احکام کو جو قرآن اور معتمد حدیثوں میں تھے چھوڑنا پڑا اور زید و عمرو کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنی پڑی۔ علم مجلس اور اخلاق اور برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریقے پر پڑ گیا ہے جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف منہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپری تپاک جتانے کا نام ہے۔ اب مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے۔ اور بے ایمانی اور دغابازی کا نام ہوشیاری۔ گفتگو پر خیال کرو تو عجیب حالت دکھائی دیتی ہے۔ ہزاروں اکھڑ مضمون زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذب اور معقول ولقہ اور نیک و دیندار آدمی بھی اپنی گفتگو میں تہذیب و شائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اگر اشراف جوان دوستوں کی محفل میں جاؤ تو سنو کہ وہ آپس میں کیسی گالم گلوچ اور فحش باتیں ایک دوسرے کی نسبت کرتے ہیں۔ امیروں کا حال دیکھو تو ان کو دن رات بٹیر لڑانے اور مرغ لڑانے اور کبوتر اڑانے اور اسی طرح تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ کام دھندا نہیں۔ اور مذہبی طبقہ کا یہ حال کہ کینہ و نخوت اور اپنے تقدس و بزرگی اور خدا پرست ہونے کا گھمنڈ مقدس لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا پاؤ گے اور اگر دنیا میں شیطان کو ڈھونڈتے پھرو تو بجز مقدسین کے جبہ و دستار مبارک کے اور کہیں پتہ نہیں ملے گا[1]

عوام کی اقتصادی بدحالی

اس زمانے میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی کس قدر خراب ہوگئی تھی اس کا اندازہ عید جیسے خوشی کے تہوار کی اس کیفیت سے ہوسکتا ہے جس کا نقشہ سرسید نے اس طرح کھینچا ہے۔ عیدگاہ میں بڑا اژدہام خلائق کا تھا تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ دھوپ میں ذرا تیزی آگئی تھی۔ عیدگاہ میں پورا فرش تو ہے نہیں اور لوگوں کو اتنا مقدور نہیں کہ مصلے خریدیں۔ ہزاروں آدمی دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

---

[1] تہذیب اخلاق ص۱۵۴

...... وہاں ہزاروں مسلمان تھے۔ مگر ایک سے ایک بدتر حالت میں۔ مسلمانوں میں عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہے۔ ہر ایک مسلمان اپنے مقدور بھر اچھے اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ پسنہاری بھی دو دو کوڑی جمع کر کے عید کے لئے اپنے بچے کو نیا جوڑا بنا دیتی ہے۔ عیدگاہ میں میں نے ہزاروں پر نظر ڈالی۔ کسی کے گلے میں بجز گزی اور دھوتر کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ کپڑے تو سب کے دھوئے ہوئے اور اجلے تھے۔ مگر ہزاروں آدمیوں کے انگرکھوں میں پیوند لگے تھے۔ اگر کسی کے گلے میں گزی کا نیا انگا تھا تو یقین جانئے پرانا پاجامہ تھا۔ جس میں چھلنی کے سے چھید تھے۔ جوتے تو کسی کے پاؤں میں ثابت نہ تھے۔ بہتوں نے رسی یا چھیچھڑے سے باندھ لئے تھے کیونکہ پاؤں سے نکل نکل جاتے تھے۔ بڑے بوڑھوں کا کچھ ذکر نہیں بچوں کو عید کے دن اچھے اچھے کپڑے پہننے کا اور کھلونوں کے لینے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ لیکن کسی بچے کا یکساں لباس نہ تھا۔ اگر سر پر چھوٹے گوٹے کی ٹوپی تھی تو پاؤں میں جوتا نہیں۔ پاجامہ نیا ہے تو انگا پرانا ہے ہر ایک آدمی پر ایسے مبارک اور خوشی کے دن میں بھی نہایت افلاس اور مصیبت برستی تھی کسی کا دل اندر سے خوش نہ تھا ہر ایک غمگین رونی صورت۔ بسورتی شکل۔ تیوری چڑھی ہوئی داڑھی پر گرد پڑی ہوئی۔ پیادہ پا چلنے سے پسینے میں شور بور۔ سب نہایت پریشان اور متفکر نظر آتے تھے۔ عیدگاہ کے باہر ایک غول بھیک منگوں کا تھا جو دو دو کوڑی مانگتے تھے اور پیچھا نہیں چھوڑتے تھے بیسیوں مسلمان سڑک پر کپڑا بچھائے بیٹھے تھے اور پکار رہے تھے "کچھ خیرات دیتے جاؤ۔ تیسوں روزے قبول"۔ ایک طرف سیکڑوں عورتوں کا غول تھا۔ اور ان میں بلبیوں بر قعہ اوڑھے چلا رہی تھیں کہ لے بیٹا ہم سیدانی ہیں فاطمہ بی بی کا دانہ کھانے والی ہیں۔ اشراف گھرانے کی ہیں۔ ہم پر مصیبت پڑی ہے۔ اپنے بال بچوں کا صدقہ خاتون جنت کا صدقہ کچھ دیتے جاؤ۔"

مفلس و محتاج مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں کی کیا حالت تھی۔ اس کا اندازہ ان لوگوں کی خوشحالی سے کیا جا سکتا ہے۔ جو عید کا تماشا دیکھنے آتے تھے اور جن کی کیفیت سرسید نے یوں بیان کی ہے۔ دو چار نوجوان ہندو بھی نہایت عمدہ گھوڑوں پر سنہری روپہلی ساز لگائے ہوئے کارچوبی تمانچہ گھوڑوں پر ڈالے ہوئے۔ نہایت عمدہ نفیس کپڑے پہنے۔ زمرد یا قوت اور موتیوں کی مالائیں اور کنٹھے گلے میں ڈالے ہوئے۔ نہایت نفیس

سرخ رنگ اور طلائی تلہ کا سہرہ باندھے ہوئے سیر کرتے پھرتے تھے، دو چار نوجوان بنگالی بھی نظر آئے تھے۔ سیاہ نفیس دو اشرفی کا ولایت کا بنا ہوا بوٹ، سفید پتلون اور کالا کوٹ اور دفلیا ٹوپی پہنے۔ ہاتھ میں خوبصورت پتلی سی پھوندنا پڑی چھڑی لئے۔ انگریزی میں غٹ پٹ کرتے۔ لوگوں کو دیکھ کر مسکراتے پھرتے تھے۔ گھوڑوں کے آگے تین چار مسلمان بھی دکھائی دئے جو کچھ آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔ جب پوچھا کہ یہ کون ہیں تو معلوم ہوا کہ لالہ چھٹامل کے بیٹے بھی سیر کو آتے ہیں اور یہ ان کے سائیس ہیں۔ انہوں نے عید سے پہلے کہا تھا کہ مہاراج ہمارا تہوار ہے اگر تنخواہ پیشگی مل جاوے تو بڑی پرورش ہوگی۔ مہاراج نے رد کر دیئے کو کہا تھا کہ یہ مُسلا تہوار تہوار پکار رہا ہے۔ آنہ روپیہ بیاج کا کاٹ کر اس مُسلے کو پیشگی تنخواہ دے دو۔" سرسید کے ذہن نے عید کی جو یہ قلمی تصویر کھینچی ہے وہ ایسی دو قوموں کا صحیح عکس ہے جن میں سے ایک جو اس ملک پہ صدیوں حکومت کر چکی تھی اپنی معاشری حالت کو بگاڑ کر نکبت و افلاس کا شکار بن گئی تھی اور دوسری جو صدیوں سے معاشری پستی اور سیاسی محکومی میں زندگی گزار رہی تھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ کی اصلاح کر کے خوش حال ہو گئی تھی۔

دولت مندوں کی خودنمائی

عام مسلمانوں کا تو یہ حال تھا اور جو لوگ خوش حال تھے وہ نمود و نمائش کے پیچھے پڑے ہوتے تھے اور مذہب اور قوم کی خدمت سمجھ کر جو روپیہ صرف کرتے تھے وہ بھی در اصل ضائع ہو جاتا تھا۔ بمبئی کے میمن جو تجارت کرتے تھے اور بہت خوشحال تھے ان کی بھی ایسی ہی حالت تھی اور ان کے متعلق سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میمنوں نے بجز اس کے کہ اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عربی عمامے باندھتے ہیں۔ اور بگھیوں میں چڑھتے ہیں اور اپنے نام اور اپنی شیخی کے پیچھے مرتے ہیں اور کچھ قومی ترقی نہیں کی۔ ان کو مسجد بنانے کا بڑا شوق ہے۔ بہت سے میمن ہیں جن کے ہاں تھوڑا تھوڑا لنگر خانہ جاری ہے۔ اور ان کی نام آوری کے لئے برائے نام ایک مدرسہ بھی ہے۔ ایک ملا اس میں پڑھانے کو نوکر ہے۔ بیزنا بالغ برائے نام طالب علم ہیں۔ لنگر خانے سے روٹی پاتے ہیں۔ دن کو ایک آدھ برائے نام سبق پڑھ لیا اور پھر کسی میمن کے لڑکے کو پڑھانے چلے گئے۔ اور کوئی شخص

مضامین تہذیب و اخلاق ص۵۳۷

کسی اور طرح سے خیرات مانگنے کا پیشہ کرنے چلا گیا۔ مجھ کو یہ حال دریافت ہونے سے نہایت افسوس ہوا اور میں نے کہا دیکھو قوم کا جو ادبار ہے تو باوجودیکہ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر کس بری طرح خرچ ہوتا ہے جس سے نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا۔ البتہ صرف چند روزہ ایک نام ہے کہ فلاں میمن کا مدرسہ ہے۔ علاوہ اس کے دو کٹ ملا خوشامدیوں نے تعریف کردی اور کہا کہ آپ نے جنت میں ایک موتی کا محل بنا لیا۔ لعنت اللہ علی الکاذبین۔ وہ لوگ مر گئے جو موتی کا گھر بناتے تھے ایسی باتوں سے تو چھوٹی کھپریل کا بھی گھر نہیں بنتا۔[۱]

جدید اور مفید تعلیم سے محرومی

مسلمانوں کی اس بری حالت کو درست کرنے کا نہایت موثر ذریعہ یہ ہو سکتا تھا کہ تعلیم کو فروغ دیا جائے لیکن تمام مسلمان انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم سے اس قدر متنفر تھے کہ ۱۸۷۵ء میں بھی جب کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم بہت ترقی کر چکی تھی پورے ملک میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف بیس تھی۔ جس میں سے سترہ بی۔ اے تھے اور صرف تین ایم۔ اے۔[۲] اور جیسا کہ سرسید نے محسن الملک کو لکھا تھا مسلمانوں کی اس زبوں حالی کو بعض غیر مسلم بھی ان کے لئے بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ الہ آباد کے اخبار پائنیر نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے اعلیٰ خاندان روز بروز گھٹتے جاتے ہیں اور تمام سلطنت کے ملازمین میں صرف بنگال میں چند مسلمان ہیں۔ وہ بھی ضعیف ہیں اور جلد پنشن لے لیں گے۔ اور ان کی جگہ یقیناً کوئی مسلمان نہیں ہوگا۔[۳] لیکن مسلمان اس صورت حال سے غفلت برت رہے تھے۔ وہ اپنے قدیم علوم پر فخر کرتے اور ان کی تعلیم کو کافی سمجھتے تھے اور تعلیم کے بارے میں ان کا یہ عام رجحان بھی ان کی معاشرتی پستی اور افلاس کا ایک بڑا سبب بن گیا تھا۔ چنانچہ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد سرسید اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں۔ اور حسبِ احتیاج وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے۔ کیونکہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ ان سے نہ لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کر سکتے ہیں۔ جو تعلیم کہ حسب احتیاج وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقل مند آدمی کا قول ہے اگر حسبِ احتیاج وقت لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور

۱۔ مسافران لندن ص۱۵۱ ۲۔ حیاتِ جاوید ص۲۰۴ ۳۔ مکتوباتِ سرسید ص۶۳

پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار اور پھر بے پروا بدمعاش ہو جاتے ہیں[1]

اس غلط رجحان کے علاوہ پوری قوم کو تعلیم دینے کی ضرورت سے بھی مسلمان ناواقف تھے اور کسی کو اس کا خیال نہ تھا۔ عوام میں اچھی بری کسی قسم کی بھی تعلیم حاصل کرنے کی نہ تو استطاعت تھی اور نہ اس کا انتظام تھا۔ سرسید کے نزدیک تعلیم معاشرہ کی اصلاح کا موثر ترین ذریعہ تھی، اور وہ چاہتے تھے کہ دولت مند مسلمان اس ضرورت کو محسوس کریں۔ چنانچہ دولت مند طبقہ کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے انہوں نے یہ کہا تھا کہ جب اولاد کی تعلیم و تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم کو نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی ہی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اپنی اولاد کے ساتھ دشمنی ہے۔ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے۔ جب تک تمام شہر اس بدہوا سے پاک نہ ہوگا کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا[2]

ہمدردوں کا غلط رویہ

مسلمان قوم کی حالت نہایت خراب ہو چکی تھی اور ان کے مستقبل کو زیادہ تاریک بنا دینے والی خرابی یہ تھی کہ پوری قوم کو اپنی زبوں حالی کا احساس اور ترقی کا خیال نہ تھا کچھ لوگ ایسے تھے جو یہ تسلیم کرتے تھے کہ ترقی و اصلاح کی ضرورت ہے لیکن وہ اپنی برائیوں کی اصلاح کے بجائے دوسروں کی کمزوریاں بیان کر دینا کافی سمجھتے تھے۔ یہ طرز عمل بہت غلط تھا۔ اور اس کے متعلق سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہمارے بعض محب وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں تو ہماری قوم کو کیوں برا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھلی کو ٹٹولیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہیئے نہ دوسرے کی آنکھ میں پھلی ہو یا نہ ہو۔ باایں ہمہ وہ لوگ اس بات میں ذرا انصاف بھی نظر نہیں کرتے اور قوم کی محبت

---

[1] مضامین تہذیب الاخلاق صفحہ ۲۲۹ ج ۲ مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، تقریر پٹنہ ۔ مئی ۱۸۷۳ء

انصاف کو چھپا دیتی ہے۔ جس قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں اس وقت اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں اصلی محبت اور سچی خیرخواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے عیبوں کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرف داری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں بہت زیادہ جلتا ہے اور حقیقت میں وہی لوگ محب وطن اور محب قوم ہیں[1]

سرسید اپنی قوم کے عیبوں پر پردہ ڈالنے والے محب وطن نہ تھے بلکہ وہ اپنی قوم کے ایسے محب اور خیرخواہ تھے جو ان عیبوں کو مٹانا قوم کی صحیح خدمت تصور کرتے تھے اور جن کو قوم کی حالت بے چین و بے قرار کر دیتی تھی۔ اس لئے وہ قوم کی تباہ حالت کو دیکھ کر پکار اٹھے کہ افسوس مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہائے افسوس! وہ امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس! وہ ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی فکر کرو اور جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے اور اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ ہے[2]۔ قوم کی بھلائی کے لئے یہی تڑپ اور سچی محبت تھی جس نے سرسید کو معاشرہ کی ہمہ جہتی اصلاح و ترقی کی جد و جہد پر آمادہ کیا اور انہوں نے جدید اور مفید علوم کی اشاعت، دینی عقائد اور اخلاق و عادات کی درستی، رسوم و رواج اور طرز معاشرت کی اصلاح و ترقی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اتحاد و تعاون اور مذہبی رواداری کے فروغ جیسے اہم امور پر توجہ کر کے اپنی اصلاحی سرگرمیوں کو ایک ایسی منظم اور کامیاب تحریک بنا دیا جس سے مسلمانان ہند کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ سرسید کی اصلاحی کوششوں میں سب سے اہم اور مفید محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ہے جس نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ادارہ مسلمانوں کی نہ صرف تعلیمی ترقی کا ذریعہ بنا بلکہ پوری مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ثابت ہوا اور اس کی بدولت مسلم قوم میں وہ بیداری پیدا ہو گئی جس نے ان کی جداگانہ قومیت کا تحفظ کیا اور وہ نہ صرف اپنے قومی وجود کو باقی رکھنے بلکہ اپنے لئے ایک الگ مملکت قائم کر لینے میں بھی کامیاب ہوئے

---

[1] تہذیب الاخلاق۔ جلد ششم [2] مسافران لندن ص ۲۵۵